مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

جدید تعلیم اور علمأ کا موقف

سر سید احمد خان کی فکر اختلاف کے باوجود اپنے یہاں جدید تعلیم کا نظم ضروری تھا

ملک کے معروف قومی اخبار ’’نوائے وقت‘‘ کے لاہور ایڈیشن کی ۴/ اپریل کی اشاعت میں معروف کالم نگار جناب [illegible] نے ’’علی گڑھ اور دیوبند‘‘ کے عنوان سے اپنا کالم لکھا۔ اس کالم میں ان دونوں تعلیمی تحریکوں کے سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالےٰ اور سرسید احمد خان مرحوم کے متعلق یہ لکھا گیا کہ:

’’دلچسپ بات یہ ہے کہ تحریکِ علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خان اور مکتب دیوبند کے بانی اور (صحیح طور پر اس تحریک علمی کے بانی) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ مولانا موصوف، مولوی رشید الدین دہلوی کے تربیت یافتہ تھے جنھوں نے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ سے علمی فیض حاصل کیا تھا۔ گویا یہ دونوں تحریکیں ولی اللّٰہی سرچشمہ سے فیض یافتہ تھیں۔‘‘

معزز نامہ نگار نے یہ بات بالکل صحیح لکھی۔ اسی طرح ان کا یہ فرمان بھی وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو صحیح ہے کہ علی گڑھ تحریک نے شاہ ولی اللہؒ کے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا جس کا تعلق شریعت محمدی کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنے اور مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے سے تھا اور تحریک دیوبند نے ان کے کام کا وہ حصہ سنبھالا جس کا تعلق مختلف اسلامی فرقوں میں مفاہمت پیدا کر کے اسلامی معاشرہ کو نقصان دہ رسوم سے پاک و صاف کرنے اور روحانیت اور شریعت کو ساتھ ساتھ رکھنے سے تھا۔

لیکن ان کے کالم کا وہ حصہ صحیح نہیں جس میں انھوں نے تحریک دیوبند کے متعلق لکھا: ’’ایک طبقہ جس میں زیادہ علماء تھے، انگریزی حکومت کے مسلمانوں پر مظالم اور عیسائی مشنریوں کے اسلام پر سوقیانہ حملوں کے باعث یورپی تہذیب سے ہی متنفر ہو گیا۔ انھوں نے انگریزی پڑھنے اور مغربی سائنسی علوم سیکھنے کی سخت مخالفت کی۔ غالباً انگریز دشمنی ہی کے زیر اثر انھوں نے سیاسی جدوجہد میں ہندو کا ساتھ دیا اور اس سے مل کر یورپ کے تصور وطنیت کو اپنا لیا۔ ان میں علمأ دیوبند پیش پیش تھے۔‘‘

جہاں تک انگریز دشمنی کے ردِّ عمل میں یورپی تہذیب سے متنفر ہونے کا سوال ہے، وہ بات اس لیے غلط

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہے کہ اسلام جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اس کی اپنی ایک تہذیب ہے، اور ایک مسلمان جس طرح اعتقادات و عبادات میں اسلام ہی کے موقف و نقطہ نظر کا پابند ہے، اسی طرح وہ تہذیب حتیٰ کہ معاشرت، معاش اور سیاست بھی چیزوں میں اسے اسلام کا پابند ہونا ضروری ہے، علما کا تنفر کسی ردِّ عمل کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وہ اسلام کا تقاضا تھا جس پر وہ انگریزی راج سے قبل بھی عمل پیرا تھے۔ بعد میں بھی عمل پیرا رہے اور یہ تنفر صرف یورپی تہذیب سے نہیں بلکہ ہر تہذیب سے تھا، حتیٰ کہ اس خطہ کی اکثریتی قوم "ھندو" جس کے ساتھ تعاون و اشتراک کا طعنہ علما کو شد و مد سے دیا جاتا ہے اور اسی کالم میں بھی دیا گیا۔ اس کی تہذیب سے بھی علما کے تنفر کا یہی عالم تھا اور آزادی کی جنگ میں اتنے قربِ تعلق کے باوصف انھوں نے کبھی اپنی تہذیبی میراث کی قربانی نہیں دی۔

سیاسی جد و جہد میں ہندو کا ساتھ دینے اور اس سے مل کر یورپ کے تصورِ وطنیت کو اپنا لینے کا جہاں تک تعلق ہے وہ بھی حقائق کی صحیح تعبیر نہیں۔ اس معاملہ میں علامہ اقبال مرحوم اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی باہمی خط و کتابت قابلِ دید و ملاحظہ ہے۔ افسوس کہ ہمارے اکثر اقبالی حضرات اس کا لحاظ نہیں کرتے۔ تاہم "حکمتِ قرآن" کے صفحات اس بحث کے متحمل نہیں۔ اس لیے اس بحث کو چھیڑے بغیر ہم اس نقطہ کی طرف آتے ہیں جس پر ہمیں اس وقت گفتگو کرنا ہے اور وہ نقطہ ہے "جدید تعلیم" کے معاملہ میں علماء کے رویے اور ان کے موقف کا۔

نوائے وقت کے کالم نگار نے جو بات آج لکھی ہے کہ:۔

"انھوں نے انگریزی پڑھنے اور مغربی سائنسی علوم سیکھنے کی سخت مخالفت کی"

یہی بات بہت عرصہ پہلے سے کہی جا رہی ہے لیکن افسوس کہ کہنے والوں کے پاس اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ پچھلے ایک صدی کے لگ بھگ لٹریچر کا جو حصہ ہماری نظر سے گزرا ہے علما کی جماعت کے ایک ہی ایسے فرد نظر آئے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی سخت اور کھل کر مخالفت کی اور وہ ہیں مولانا احمد رضا خاں بریلوی جو ١٩٢١ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے نام و نسبت سے آج ایک باقاعدہ تحریک موجود ہے۔ موصوف نے فتوے کے میدان میں سخت لب و لہجہ اختیار کیا اور قریب العہد ہم عصر شخصیات اور جماعتوں میں سے کسی کو معاف نہیں کیا۔ ادھر انھوں نے "اعلام الاعلام بان ھندوستان دارالاسلام" نامی رسالہ ١٣٠٦ھ / ١٨٨٨-٩ء میں سپردِ قلم کیا جس کا موضوع اپنے نام سے ظاہر ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر یہ عبارت ہے:۔

"اس میں اس امر کی تحقیق کہ ہندوستان دارالاسلام ہے"

ان کے علاوہ کسی ذمہ دار عالمِ دین بالخصوص تحریک دیوبند سے وابستہ علما میں سے کسی نے بھی تو ایسی بات نہیں کہی۔ بلکہ اس تعلیمی تحریک کے سرخیل امامِ اعظم حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلف الرشید

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالےٰ کا فتوےٰ جس میں انگریزی زبان کی تعلیم وتعلم کو درست قرار دیا گیا ہے۔ خود سرسید احمد خان مرحوم نے اپنے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں نقل کیا ہے۔

ان کے علاوہ افتا کے اعتبار سے اس حلقے کے سب سے مؤثر اور ذمہ دار بزرگ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے جب یہ سوال ہوا کہ "انگریزی پڑھنا پڑھانا درست ہے یا نہیں؟"

تو مولانا نے جواب میں فرمایا "انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور کوئی نقصان دین (کا) اس سے نہ آئے۔" (تفصیل فتاویٰ رشیدیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔)

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالےٰ کا فتوےٰ "مجموعۃ الفتاویٰ ج ۱، ص ۱۱۱" میں جس میں حضور علیہ السلام کے اس حکم کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں آپ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو یہود کا خط سیکھنے کا کہا تھا" انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قرار دیا۔

© rasailojaraid.com

اسی طرح مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالےٰ کا فتوےٰ فتاویٰ امدادیہ جلد ۴ ص ۱۹۰، ص ۱۹۱ میں ہے اس میں آپ نے ایک تو اس آیت قرآنی کا حوالہ دیا جس میں اللہ تعالےٰ نے رنگتوں اور زبانوں کے اختلاف کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا (سورۃ روم) دوسرے وہی زید بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو دیے گئے حکم نبوی کا ذکر کیا تیسرے اس بات کا ذکر کیا کہ اس زمانہ میں فارسی آتش پرستوں کی زبان تھی لیکن حضور علیہ السلام کا اس کے ذریعے تکلم کرنا ثابت ہے (ابن ماجہ) اور پھر آخر میں لکھا۔

"سو اگر کوئی ایسا شخص جو اپنی ضروریات دینیہ، عقائد ومسائل سے واقف ہو اور ظن غالب ہو کہ یہ شخص بوجہ صحبت کفار وفجار کے ان کے خیالات یا رسوم یا وضع کی طرف مائل اور اپنے دین سے سست عقیدہ نہ ہوگا واسطے کسب معاش وغیرہ کے انگریزی یا ہندی پڑھے جائز ہے۔"

اور تحریک دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور اس تحریک کے ایک اہم ستون مولانا سید محمد انور شاہ کے اس سلسلہ کے خیالات سوانح قاسمی اور انوار الباری میں دیکھے جا سکتے ہیں جنہیں مرتب کیا مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا سید احمد رضا بجنوری نے۔

بلکہ ہم آپ کے سامنے ایک حوالہ اور پیش کرتے ہیں جو چھپا مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کی جلد نمبر ۱۱ عدد نمبر ۳ ص ۲۲۱، ص ۲۲۲ پر اور لکھنے والے ہیں چودھری غلام احمد صاحب پرویز جو آخر وقت تک مولوی دشمن بالخصوص دیوبندی علما کی دشمنی میں سرگرم عمل رہے۔ موصوف حکومت برطانیہ کے غالباً ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ لکھنے لکھانے کا مشغلہ ساتھ تھا۔ "طلوع اسلام" تو اپنا رسالہ تھا لیکن اس سے قبل مختلف رسائل میں اپنے مضامین چھپواتے۔ کبھی اصلی نام سے کبھی قلمی ناموں سے۔ "متاع کارواں" کے عنوان سے ترجمان القرآن بابت ماہ رمضان ۱۳۵۶ھ

© rasailojaraid.com

کا ان کا یہ مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے حقیقی اسباب پر گفتگو کی اور ثابت کیا کہ اس مصیبت عظمیٰ کا باعث سرکار برطانیہ کی ایک منظم اسکیم تھی اس کی تفصیل بھی انھوں نے دی جس کے دہرانے کا موقع نہیں۔ اور پھر لکھا:۔

"الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ملّانوں نے انھیں انگریزی پڑھنے سے روکے رکھا۔ اس لیے یہ قوم تعلیم میں پیچھے رہ گئی لیکن مذکورہ صدر واقعات کو سامنے رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے والے ان کے ملّانے تھے یا ایک منظم اسکیم تھی؟ ملّانے جو یوں بدنام کیے جاتے ہیں ان کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا، علوم جدیدہ کا حاصل کرنا، اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے علماء حضرات کو تو مفت میں مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔"

کتنی زبردست شہادت ہے مولوی ملانے کی نہیں خالص تعلیم یافتہ بزرگ کی جو سرسید احمد خان مرحوم کی تعلیمی اسکیم کے ہی علمبردار نہ تھے بلکہ ان کے فکری اور اعتقادی ورثے کو بھی بڑھانے اور چلانے والے تھے یہاں عبدالرشید صاحب اور ان جیسے بہت سے حضرات کے شاید اس معاملہ میں وہ استاذ تھے کہ ان لوگوں نے ہندو سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ خیر اس بحث کو چھوڑیے اور نظر اس پر رکھیے کہ تعلیم کے معاملہ میں مولوی کے سر پر تھوپے جانے والے جرم کی صفائی پرویز صاحب دے رہے ہیں اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ مولوی نے یہ جرم کیا نہیں۔ حقائق اور واقعاتی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔

علمائے کے ان فتاوے اور پرویز صاحب کے اس نوٹ کے بعد مزید ضرورت تو نہیں رہتی لیکن ہم ذرا اس بات کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سرسید احمد خان مرحوم اور علماء صادقین کے درمیان اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟

اس میں شک نہیں کہ سرسید احمد خاں مرحوم بھی شاگرد تھے مولانا مملوک علی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اور ابتدا میں ان کے عمومی خیالات ویسے ہی تھے جیسے عام ہندوستانی اہل علم کے جس پر سب سے بڑی سند ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" ہے لیکن اس کے بعد ان کی قلب ماہیت ہوئی۔ اس سوال پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ کیوں ہوئی لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہوئی اور اس کی متعدد موثق شہادتوں میں ایک اہم ترین شہادت ان کی کتاب سرکشی بجنور ہے جس میں مرحوم نے ہر آزادی خواہ اور فدائے ملک و ملت کو بری طرح لتاڑا۔

ادھر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید کے مابین ہونے والی خط و کتابت ملاحظہ فرمالیں "جو تصفیۃ العقائد" کے عنوان سے شائع شدہ موجود ہے۔ اس سے اندازہ کرنا آسان ہوگا کہ سید صاحب موصوف کی کج فکری پر علماء

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

نے اصلاحی مضامین وجواب لکھے جنھیں ان کی تعلیمی تحریک پر کوئی تنقید یا تنکیر نہ تھی تعلیمی تحریک کے سلسلہ میں اگر علمائے گستاخی کی تو صرف اس قدر کہ ان سے یہ عرض کیا کہ اس میں ذرا دینی اور مذہبی تعلیم کا بھی اہتمام کر لیا جائے لیکن وہ برہم ہوتے اتنے کہ الامان۔

"تہذیب الاخلاق" کے حوالے سے دو عبارتیں ملاحظہ فرمالیں اور علمائے پہ بد زبانی اور سخت زبانی کا الزام لینے والے اس مقدس زبان پر بھی ذرا نظر رکھیں۔

"بڑے بڑے معمم (عمامہ والے) اور مشمشل (شملہ والے) قدوسی عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ، عقائد اور فقہ واصول وتفسیر وحدیث وعلم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائے جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ محققانہ تعلیم مذہبی اصول حقہ واقعیہ پہ بلاشبہ مانع نقصان عقائد حقہ اسلامیہ کے ہوگی مگر تقصیر معاف ہو اندھی تقلیدی تعلیم مذہبی تو مانع نقصان عقائد نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج کر نہیں سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جاویں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بداعتقادی پھیلے گی۔"

(بحوالہ روشن مستقبل صٓ۲۰۳ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

دوسری جگہ اس طرح لتاڑا اور پچھاڑا کہ:-

"اس زمانہ میں پرانے طریقے پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لیے جونپور، علی گڑھ، کانپور، سہارن پور، دیوبند، دہلی، لاہور میں جاری کیے ہیں۔ مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں۔ قدیم کتابیں ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی کی تعلیم نہیں کرتیں۔ برخلاف اس کے جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا اور تکبر اور غرور کو خودپسندی کا منبع بنانا اور اپنے ابنائے جنس سے نفرت کرنا اور ہمدردی نہ رکھنا سکھاتی ہیں۔ (تہذیب الاخلاق ج ۲ ص۹۶۴)

گویا موصوف کے نزدیک قدیم کتب درسیہ جن میں تفسیر وحدیث سبھی شامل ہیں وہ لامذہبیت اور بداعتقادی کا باعث ہیں اور ان کی تعلیم کے لیے جو مدرسے قائم ہوئے جنھیں بوریہ نشین علمائے نے خونِ جگر سے سینچا اور غریب مسلمانوں نے برائے نام چندوں سے اعانت کی لیکن بڑے اخلاص کے ساتھ، وہ بے فائدہ اور لغو ہیں۔ قدیم کتابیں نہ آزادی کا سبق پڑھاتی ہیں نہ راستی وسچائی کا اور نہ صفائی کا۔

اس تفصیل کے بعد کسی ذی شعور پر یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ سرسید احمد خاں کیا چاہتے اور وہ قوم کو کس طرف

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

لے جانا پسند کرتے تھے؟ اس پر بھی کسی کی تسلی نہیں ہوتی تو ہم توجہ دلائیں گے لارڈ میکالے کی تعلیمی اسکیم کی طرف جو ۱۸۳۵ء میں (یعنی انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۲۲ برس قبل) ایک رپورٹ کی شکل میں سامنے آئی جس میں ہندوستان کے ہر باشندے کے ذہن وفکر کو بدل کر انگریزی بنانا مقصود تھا۔ (ملاحظہ فرمائیں تاریخ تعلیم مطبوعہ کراچی) صـ۸۷ اور پھر تہذیب الاخلاق جلد دوم کا پہلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں۔ جناب سید فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلزیشن یعنی تہذیب (کونسی تہذیب؟) اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوں اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب کہلائیں۔"

لارڈ میکالے کی رپورٹ کو ہم نے طوالت کے خوف سے نقل نہیں کی اس کا خلاصہ نقل کر دیا۔ سید صاحب کا ارشاد لفظاً نقل کر دیا۔ دونوں کی لے ملاحظہ فرمالیں۔ سید صاحب کے متعلق کہنا پڑ گیا کہ انھی کی بات اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں لیکن انداز ایسا ہے کہ مسلمان معزز و مہذب کہلانے کے شوق میں راغب ہو جائیں۔ جناب سید ترکوں پر بڑے خوش ہیں جیسا کہ مولانا طفیل احمد علیگ مرحوم نے ان کا ارشاد نقل کیا۔ اس خوشی کا سبب یہ ہے کہ ترکوں نے معاشرت وہ اپنا لی ہے کہ ان میں اور یورپین حضرات میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ سر سید احمد خاں صاحب کے سوانح نگار مولانا حالی مرحوم نے انھیں "اصلاح مذہبی کا بیڑہ اٹھانے والا" لکھا کیونکہ حالی مرحوم کے الفاظ میں "مسلمانوں کا اعتبار حکمران قوم کی نظر میں روز بروز کم ہو رہا تھا" اس لیے اصلاح مذہبی کی ضرورت تھی اور اصلاح مذہبی ایسے ہی ممکن تھی کہ دین حق میں "ترمیم و تحریف" کا دروازہ کھول کر ایسی روش اختیار کی جائے کہ حکمران قوم خوش ہو جائے۔

یہ ہے تعلیمی تحریک کا اصل پس منظر جس کی بنیاد پر غریب علمائے جناب سر سید احمد خاں صاحب کے رویہ سے اختلاف کیا ورنہ نفس تعلیم انگریزی سے اختلاف کی نہ کوئی وجہ تھی اور نہ ایسا ممکن تھا اور نہ علما نے ایسا کیا۔ ہم ان کے فتووں کے ساتھ ساتھ پرویز صاحب کا حوالہ نقل کر چکے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میدان میں قوم کی پسماندگی کا سبب انگریزی پالیسی تھی نہ کہ ملانوں کا طرز عمل۔ علما بے چاروں کی مجبوری یہ ہے کہ انھیں "ٹریفک کے سپاہی" کے طور پر اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے چاہے اس کی زد میں کوئی آ جائے؟

جمعیۃ علمائے ہند جس کے سیاسی رویہ پر ہمارے اہل دانش اکثر ناراض رہتے ہیں اور اسے ہندوؤں کا ایجنٹ تک کہہ دیتے ہیں، اس نے اپنے اجلاس مارچ ۱۹۳۸ء میں واردھا تعلیمی اسکیم تک کو معاف نہ کیا۔ انھوں نے اس تعلیمی اسکیم پر غور کرنے کی غرض سے ایک سب کمیٹی بنائی۔ اس نے غور کیا اور کامل غور کیا۔ پھر رپورٹ دی۔

© rasailojaraid.com

واردھا تعلیمی اسکیم میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کا اہم رول تھا۔ ڈاکٹر صاحب خدا ترس، نیک نفس اور ہر اعتبار سے لائق تعریف تھے علماء کے حلقوں میں ان کا احترام تھا اور وسیع تعلقات تھے۔ لیکن جب مرحوم حالات کی کشاکش کے سبب غلطی کا شکار ہوئے اور انھوں نے ایک دفعہ اس طرح کی لکھ ڈالی کہ:

"بچوں کے ذہن میں ابتدا ہی سے رواداری اور روشن خیالی پیدا کرنے کے ذرائع اختیار کرنا اور ان کو تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مفید شہری اور کارگزار ان بنانا۔"

تو جمعیت کے مظلوم اور معتوب مولویوں نے ٹوکا اور سختی کے ساتھ اپنی رپورٹ میں کہا کہ:

"ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو، نظری تعلیم کے ساتھ بنیادی دستکاری کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کا عام ہونا سب باتیں صحیح و درست لیکن یہ چوتھا نقطہ اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ ایک ہی تہذیب اور ایک ہی قسم کے عقائد اور مشابہ اعمال کی پابندی ہو جائے۔ نیز یہ کہ اس میں ان باتوں کی اصلاح ضروری ہے کہ تعلیم مخلوط نہ ہو، مسلمان بچوں کو گانے بجانے کی تعلیم نہ دی جائے، تصویرکشی جیسے فنون انھیں نہ سکھائے جائیں اور جو مسلم بچے حفظ قرآن وغیرہ میں مشغول ہوں انھیں جبری تعلیم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔"

علماء نے کانگریس سے اپنے تعلقات وغیرہ کسی چیز کا خیال نہ کرکے وہ بات کہی جو انھیں کہنی چاہیے تھی۔ اس پر انھیں تنگ نظر اور نہ معلوم کیا کیا کہا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح سرسید کی تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں ہوا۔ علماء کو انگریزی پڑھنے پڑھانے سے اختلاف نہ تھا۔ انھیں اختلاف تھا تو اس سے کہ اس آڑ میں انھیں "انگریز" نہ بنایا جائے۔

باقی وہ ادارے جنھیں سرسید احمد خان صاحب لغو قرار دیتے وہ ایک دانش ور کے قول میں "اسلامی شریعت و تہذیب کے قلعے" ہیں۔ انھوں نے لکھا:

"اگر کہیں برائے نام اسلامی سلطنت ہے بھی تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے دین دار، امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں لیکن اگر کسی ملک میں بدقسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کرسکتی ہے اور حفاظتِ دینی کا فرض انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف جماعت علماء ہے۔ اسی نکتہ کے سبب زوال حکومت کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس و تدریس کا وہ نظام قائم کیا جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں۔"

© rasailojaraid.com

اس تفصیل کے بعد اگر کوئی سوال کرتا ہے کہ اگر علماء نے سرسید احمد خان کی تعلیمی اسکیم کی مخالفت نہیں کی، انگریزی پڑھنے پڑھانے سے نہیں روکا اور یہ سب باتیں صحیح ہیں تو پھر مسلمان اس میدان میں کیوں پیچھے رہ گئے۔ گو اس مضمون کے حوالے سے ہم پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ ہم اس سوال کا جواب دیں لیکن ہم مختصراً اس پر گفتگو کرنے میں حرج نہیں سمجھتے۔

یہ بات تو حقیقت ہے کہ انگریزی عمل داری سے قبل (چاہے وہ کمپنی کی شکل میں ہو چاہے بالکلیہ حکومت کی صورت میں) مسلمانوں کا تعلیمی سسٹم عجیب و غریب تھا اور گویا ہر طرف علم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی کی نگرانی میں بعض اہل علم مرانش نے تعلیمی ہند کے نام سے ایک عجیب و غریب مجموعہ مرتب کیا۔ جس میں مسلمانوں کی ابتداء سے اپنے وقت تک اس خطہ میں ان کی تعلیمی کیفیت کا بڑا مختصر لیکن جامع تذکرہ تھا۔ اس میں بعض ذمہ دار انگریزوں کی شہادتیں درج تھیں کہ یہاں مسلمان کس طرح خدمت علم میں مشغول تھے۔ "جان ہیبٹ" کے بقول "ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ جمایا تو اس وقت قومی تعلیم کا سلسلہ بہت کافی طور سے موجود تھا" پروفیسر ماکس میلر کے بقول آبادی کے ۲۰۰ افراد کیلئے ایک درسگاہ "موجود تھی اور ۱۸۲۰ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ۳۱ لڑکوں کے لیے ایک درس گاہ تھی۔ لیکن یہ سب سسٹم بدلا اور اس طرح کہ یہاں اُتو بولنے لگے اور یہ سب منظم پلاننگ اور اسکیم تھی سرکار برطانیہ اور اس کے کارندوں کی۔ انگریز کا ذہن ڈیوک آف ڈیون شائر کے بقول یہ تھا کہ:-

"یہ غیر دانشمندانہ فعل ہے کہ ہندوستانی زیور تعلیم سے آراستہ کیے جائیں۔ جدید تہذیب، جدید ترقی اور جدید علم و ادب سے انہیں سیراب کیا جائے"

جسٹس سید محمود اپنی کتاب تاریخ التعلیم میں کہتے ہیں کہ:-

"انگریز بہادر تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کرتے لیکن اہل ہند کو تعلیم دینا وہ اپنا فرض نہ سمجھتے۔ (ص ۲)

اس قوم کو جاہل رکھنا۔ اس کے علم کے سوتے خشک کرنا اور اس کی پہلے سے قائم درس گاہوں کی خانہ ویرانی انگریز کی بنیادی پالیسی تھی۔ کیوں؟ اس کا اندازہ اور جواب "امکنس سمنڈے" کی تحریر سے لگے گا۔

"جب کوئی قوم یا ملک غلام بنایا جاتا ہے تو فاتح سب سے پہلے یہ کام کرتا ہے کہ تعلیم کو تباہ کر دیتا ہے یا بہت بری طرح سے انتظام کرتا ہے چوں کہ علم اور غلامی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ (تعلیمی ہند ص ۴۸)

بعض انگریزوں کی طبیعت میں سلامتی تھی۔ وہ اس بات کو محسوس کرتے تھے اور بڑی شدت کے

© rasailojaraid.com

ساتھ، مثلاً سر تھامس نے دارالعوام کی تقریر میں کہا۔

" ہندوستانیوں کو فائدہ کیا دو گے؟ تم نے ان لوگوں کے ملک کو خراب کیا اور انسانوں کو برباد کیا۔ تم نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ان لوگوں کو دھوکہ، دغا اور جہالت میں مبتلا کر دیا" (تعلیمی ہند ص۵)

انگریز سمجھتا تھا اور خوب کہ اس نے حکومت و اقتدار مسلمان سے چھینا ہے، اس لیے اسے دبانا ہی ضروری ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ تو یہ سلوک ہوا اس کے بالمقابل ہندو کالج اور ایسے ادارے خوب پھلے بلکہ ان پر خصوصی توجہ دی گئی۔ تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ ۱۸۳۱ء سے واضح ہوتا ہے کہ ہندو کالج کی حوصلہ افزائی اس کے خاص مقاصد میں شامل تھا (تاریخ تعلیم از سید محمود ص۳۵) اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انگریز کو کوئی ہندو سے پیار تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ایسے اداروں میں "انجیل مقدس" کی تعلیم خوب خوب رنگ لا رہی ہے اور "مقدس مسیح" کے نام لیوا بڑھ رہے تھے۔

۱۸۵۳ء میں سر فریڈرک نے تسلیم کیا کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان تک کے پبلک سکول میں نہیں۔ ۱۸۴۴ء میں واضح کر دیا گیا کہ اب سرکاری ملازمت اسے ملے گی جو انگریزی جانتا ہو گا تو لوگ اس طرف مجبوراً متوجہ ہوئے لیکن ستم یہ تھا کہ تعلیمی ادارے تعلیم کے لیے کم اور اعتقادی ارتداد کے لیے زیادہ تھے۔ وہ فی الحقیقت مقدس باپ کے روپ میں پادریوں جیسی مخلوق کے اڈے تھے۔ سید محمود صاحب نے "تاریخ تعلیم" کے ص۶۶، ص۶۷ پر اس بات کا رونا رویا اور بتلایا کہ اس پالیسی کے نتیجہ میں لوگ کس قدر عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔

مسلمان اپنے عقیدہ کے معاملہ میں روزِ اوّل سے حساس رہا ہے اور اسے یہ بات کسی طور پر گوارا نہ تھی کہ تعلیم کے نام پر اس کی متاعِ ایمان کو لوٹا جائے لیکن انگریز تھا کہ وہ ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اصلی محرک مسلمان کو قرار دیتا جیسا کہ "حکومت خود اختیاری" کے مصنف مولانا طفیل احمد صاحب نے انگریز اہلِ دانش کی تحریروں کا ذکر کیا۔ " ہنری ٹامس "، گورنر بنگال کی بات خاص طور پر نقل کی کہ وہ کس طرح مسلمانوں پر برستا ہے۔

" مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ غدر ہے۔ یہ خلیفۂ اوّل سے لے کر اب تک مغرور، ظالم، اور غیر رواداررہے ہیں۔ ان کے سامنے ہمیشہ اسلامی حکومت کا قیام رہا۔ عیسائیت سے ساتھ نفرت ان کی گھٹی میں ہے کسی دوسرے مذہب کی نام لیوا حکومت کے ساتھ ان کا نباہ قرآن کی رو سے ممکن نہیں۔ (ص۵۵، ص۵۶)

© rasailojaraid.com

بس اس سبب سے انھیں جاہل رکھنا اور دکھ پہنچانا ضروری ٹھہرایا اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی راہیں ان پر بند کردی گئیں۔ جو مسلمان بقول سر تھامس عزم صمیم اور ذہنی صلاحیت کے طور پر سب سے فائق تھا اور تعلیم و تعلم میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ وہ ڈاکٹر ہنٹر کے بقول اس سطح پر آگیا کہ چپڑاسی، دفتری اور چٹھی رساں جیسی نوکری اس کا مقدر ٹھہری (بحوالہ روشن مستقبل ص۱۵۹) مسلمان اتنے گر گئے کہ سرکاری اور اعلیٰ افسران ان کے وجود کو ہی تسلیم نہ کرتے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۵۸)

اس پس منظر میں تعلیم جدید کو مسلمانوں کی مشکلات کا حل بتانے والے حضرات پر لازم تھا کہ وہ قومی غیرت اور وقار کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا اہتمام کرتے۔ انگریزی دروازے پر دریوزہ گری کے بجائے عزم و ہمت سے آگے بڑھتے لیکن انھوں نے کوسا تو غریب ملاؤں کو، لغو قرار دیا تو مدارس کو جہالت کی پوٹ بتلایا تو قدیم تعلیمی ذخیروں کو اور بقول حالی "اصلاح مذہب" کا بیڑا اٹھا کر مذہب میں تحریف و ترمیم کی طرح ڈالی اور ساتھ ہی یہ لازمی قرار دیا کہ جو سکول بنے اس میں ایک جنٹل مین یورپین ہیڈ ماسٹر ضرور ہو۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کی رپورٹ ۱۸۸۶ء ملاحظہ فرمائیں کہ سر سید احمد خان ایک یورپین ہیڈ ماسٹر پر کتنا زور دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان حکومت چھن جانے کے بعد مذہب کی قربانی دینا گوارا نہ کرتے بالخصوص جب ان کے کان میں یہ آواز پڑی کہ:۔

"اللہ نے ہمیں موقع دیا ہے تو تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر پوری قوت سے عمل شروع کردینا چاہیے۔" (تقریر مسٹر منگلس)

تو اور زیادہ بدکے مسلمانوں نے اپنے طور پر چھوٹے پیمانے پر اسکولوں کا سلسلہ قائم کیا تو اس پر سید صاحب برہم ہوئے اور سب سے زیادہ اس وجہ سے برہمی ظاہر کی کہ ان میں لائق یورپین ہیڈ ماسٹر نہیں (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رپورٹ ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) اور دو سال بعد ۱۸۸۹ء میں کہا کہ اگر ہمارے مدرسۃ العلوم (علی گڑھ) کے ہوسٹل میں مسجد کی فاتحہ کی روٹیوں پر پلنے والوں کی طرح کی مخلوق جمع کرنی ہے اور چار پانچ روپیہ ماہوار کے میاں جی کو معلم بنانا ہے تو خدا کرے کہ بھونچال آئے اور یہ مدرسہ زمین میں دھنس جائے۔

(انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲ جولائی ۱۸۸۹ء)

انھیں بس اعلیٰ تعلیم کا جنون تھا جس کے ذریعے راجواڑوں کے شہزادے اور مراعات یافتہ مسٹر بیک جیسے پرنسپلوں کی نگرانی میں "صاحب اور کلرک" بن سکیں اور بس۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ رویہ درست نہ تھا، انگریز سے مرعوب ہو کر اس کے خیالات کی ترجمانی، اپنے دین میں ترمیم و تحریف، عیسائی مشنوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنا اور انگریز پرنسپلوں کی بالادستی کے نتیجہ میں جو برگ و بار سامنے آئے اس کی ایک شہادت تو ڈاکٹر ہنٹر کا

© rasailojaraid.com

قول ہے جس میں وہ کہتا ہے :-

"ہمارے انگریزی سکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو" (مسلمانان ہند ص۱۴۲)

اور ایک شہادت ہے مسلم لیگ کے سرکاری اخبار "منشور" کی اور یہ شہادت وقیع اور اہم اس لیے ہے کہ سرسید کی اسکول نے جو سیاسی شکل اختیار کی اس کا نام مسلم لیگ تھا۔ ۱۹۰۶ء کا شملہ وفد جو سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے سے ملا اور جس کے لیے تحریری یادداشت علی گڑھ کے پرنسپل مسٹر بیک نے تیار کی اسی نے بعد میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم کی اور لوگ اب بھی فخر سے کہتے ہیں کہ علی گڑھ کو پھیلاؤ تو وہ پاکستان بن جائے گا اور پاکستان کو سمیٹو تو وہ علی گڑھ بن جائیگا۔ مسلم لیگ کے دور شباب میں "منشور" نے اپنے ادارتی کالموں میں لکھا۔

"گزشتہ تیس برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اسلامی کلچر، اخلاق، اور اسلامی تصورات سے بالکل نابلد ہیں۔ (۹ جون ۱۹۳۹ء)

ان گزارشات سے یہ ثابت ہوا کہ علماء جدید علوم اور انگریزی زبان کے دشمن نہ تھے۔ انھیں اختلاف تھا تو میکالے کی اسکیم سے جس کے نتیجہ میں نوجوانان وطن کی قلب ماہیت کا خطرہ تھا۔ بدقسمتی سے سرسید احمد خان اس رنگ میں رنگ چکے تھے کہ وہ انگریزی کلچر اور تہذیب و ثقافت میں ہی عافیت خیال کرتے اور ان کے نزدیک مسلمانوں کی نجات اب اسی میں تھی اور اسی پر بس نہیں وہ اصلاح مذہب کے علم بردار بن کر دینی اقدار کا حلیہ بگاڑنے پر لگ گئے۔ سادہ اور سستی تعلیم ان کے نزدیک بے کار اور مہنگی تعلیم سے مسلمان متنفر کہ اس میں تعلیم کم اور عیاشیت زیادہ تھی۔ لیکن سرسید اور ان کے رفقاء اسی پر مصر جس کے برگ و بار مذہب و دین سے بے گانگی کی شکل میں سامنے آئے جس کی ایک شہادت نہیں دو شہادتیں گزریں اور واقعاتی شہادت پاکستان کے ۴۰ سال کے اہل سیاست، بیوروکریٹس اور متمول لوگ ہیں جو خود تو ڈوبے ہیں۔ باقی کا بھی بیڑا غرق کرنے میں معروف ہیں۔ اور ہاں اس شجر تعلیم کے برگ و بار پر دو شہادتیں اور آخر میں ملاحظہ فرمالیں۔

مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جناب اکبر الہ آبادی کی۔ وہ بہر طور روایتی ملّائے نہ تھے شاید ان کے بعد کسی کی آنکھ کھلے اور اب بھی کوئی ہوش کے ناخن لے لے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا :-

"یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب

© rasailojaraid.com

فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمنّا وصدقنا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروغ اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور یہاں اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ وہاں سارا نظام شریعت وحی و رسالت کے اعتقادات پر قائم ہے اور یہاں وحی کی حقیقت میں ہی شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ وہاں حیات اخروی کا اعتقاد پوری اسلامی اخلاقیات کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور یہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ وہاں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں یہاں وہ محض عہد جاہلیت کی رسوم ہیں جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصول تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے۔ رسُول خدا شارح قانون اور انسان صرف متبع قانون مگر یہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں لیجسلیچر واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی اسلام کا رخ (INTERNATIONAL) بین الملیت کی طرف ہے اور مغرب کا کعبہ مقصود (NATIONALISM) ہے معاشیات میں اسلام اکل حلال اور زکوٰۃ وصدقہ پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظام معاشی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدود زن و مرد، تعدد ازدواج، قوانین نکاح و طلاق، ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور راستی کا معیار سمجھ لیا پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام کو برسر غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدہ سے نہیں ہو سکتی۔ (ترجمان القرآن جلد ۵ عدد ۱)

اور اکبر الہ آبادی کی سن لیں وہ کیا فرماتے ہیں:۔

نظم!

اک مس سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش

کوئی لکھتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بد خصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہوکے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ، انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے سیکھو ان کے انداز و طریق
ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش!

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقوے کو کردو پاش پاش!

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہوگیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

ان کی چتون سحر آگیں، ان کی باتیں دلربا
چال ان کی فتنہ خیز ان کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغ آتش رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں برف کی کوئی یہ قاش

بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرت سید سے جاکر عرض کرتا کوئی کاش!

درمیان تعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

گزشتہ سطور سے یہ واضح ہوگیا کہ علماء انگریزی یا کسی دوسری زبان اور جدید علوم و فنون کے مخالف و دشمن نہ تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کالج اور یونیورسٹی کے ماحول میں جلنے والے حضرات فکری اور اعتقادی طور پر گمراہی کا شکار نہ ہوں اور ایک موقع پر تو یہاں تک ہوا کہ محسوس ہونے لگا کہ یہ دونوں تعلیمی تحریکیں جو مختلف دھاروں کی شکل میں بہہ رہی

© rasailojaraid.com

ہیں باہم مل کر ایک ہی رخ اختیار کرلیں۔ اس کا ثبوت وہ پیشکش ہے جس کے ذریعہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کو اس ادارہ کے اسلامی اور دینی شعبہ کے نگران کے طور پر بلایا گیا۔ مولانا خود تشریف نہ لاسکے تو اپنے قریبی عزیز اور تربیت یافتہ مولانا عبداللہ انصاری کو اس مقصد کے لیے بھیج دیا اور اس کا ثبوت وہ تجویز بھی ہے جو کچھ عرصہ بعد مولانا نانوتوی کے خصوصی شاگرد اور رفیق یافتہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی طرف سے پیش ہوئی۔ دیوبند کے ۱۹۱۰ء کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر علی گڑھ کے شیخ الجامعہ سید محمود تشریف فرما تھے۔ دونوں اداروں کے فضلاء کے باہمی تبادلے کی تجویز مولانا محمود حسن نے پیش کی۔ دوسری طرف سے اس کا خیر مقدم ہوا اور کچھ عرصہ تک اس پر عمل بھی ہوتا رہا۔

لیکن ایک سوال بجا طور پر سامنے آتا ہے کہ علمأ کرام جو بجا طور پر قدیم تعلیمی ورثہ کو سنبھالنے کے ساتھ ملک کی آزادی کے لیے بھی سرگرم عمل تھے۔ انھوں نے دور حاضر کے اس چیلنج کو تو دکیوں قبول نہ کیا اور اپنے اداروں میں کیا مشکل تھی کہ انھوں نے جدید علوم وفنون کو اپنے نصاب کا حصہ نہ بنایا۔ مولانا نانوتوی کے متعلق روایت نقل کی۔ دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے کہ سفر حج پر جب ان کی ملاقات جہاز کے یورپین گورنر سے ہوئی تو وہ بہت متاثر ہوا۔ مولانا نے اس خواہش وعزم کا اظہار کیا کہ ہم واپس جاکر یہ زبانیں سیکھیں گے تاکہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کا پیغام اور اس کی دعوت پیش کرسکیں۔

اس روایت کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے صدر شعبہ اسلامیات مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی سوانح قاسمی" میں نقل کیا تو پھر سوال یہ ہے کہ مولانا نانوتوی نے اس معاملہ کو آگے کیوں نہ بڑھایا؟ وہ دیوبند کے مدرسہ کے ہی نہیں اس پوری تحریک کے فکری راہنما تھے، ان کے لیے ایسا مشکل نہ تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا اسی سفر میں بیمار ہوئے۔ واپسی پر مہلت حیات زیادہ نہ ملی اور اس دنیا سے وہ چل بسے۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اخلاف اور جانشینوں نے اس طرف توجہ کیوں نہ دی؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ایسے رجال کار پیدا ہوتے جو ایک طرف قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کے ماہر اور اسپیشلسٹ ہوتے تو دوسری طرف وہ جدید دنیا کے افکار سے بخوبی واقف ہوکر انھی کی زبان میں ان پر نقد وجرح کرسکتے۔

اب تک ایسا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ اب جب کہ ہم ایک آزاد نظریاتی ریاست میں جی رہے ہیں تو اب بھی علمأ نے اپنے نصاب پر نظر ثانی اور کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ اگر کسی طرف سے ایسی تجویز آتی ہے تو اس پر غیظ وغضب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہماری گستاخی معاف! یہ خوگر حمد کا گلہ ہے کہ ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اگر سرسید احمد خان، ان کے رفقاء اور اخلاف نے یک طرفہ ٹریفک کا اہتمام کیا تو ایسا ہی کام حضرات علماء نے کیا۔ علمأ کرام کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ آزاد ماحول میں ادارے چلا رہے تھے، قوم کا غریب

© rasailojaraid.com

اور متوسط طبقہ ان کی ہر آواز پر لبیک کہتا اور ان کی ہر اپیل پر اپنا خون جگر تک پیش کر دیتا، ایسے بااثر اور باہمت عوام کے تعاون کے ہوتے ہوئے علماء جیسے ذمہ دار طبقہ کے لیے اپنی درس گاہوں میں ان علوم اور زبانوں کی تدریس کا اہتمام کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا اور اگر انھوں نے اس کا احساس کیا ہوتا اور ایسے "بہ صفت موصوف رجال کار" تیار کیے ہوتے تو آج ہمارے انتظامی، عدالتی اور زندگی کے دوسرے شعبوں کا یہ حال نہ ہوتا۔

انگریزی دور کے بعد اب بھی حکومتیں تو اسی پرادھار کھائے بیٹھی ہیں کہ وہ اسی فرد کو عہدہ و منصب بخشیں گی جس کے پاس کالج و یونیورسٹی کا ڈپلوما ہو۔ کیا ہمارے دینی مدارس کے باصلاحیت طلبہ جو ۸ سال میں ۲۲ علوم و فنون کی ۴۲ انتہائی مشکل ترین کتابیں گھونٹ کر پی جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس کے ساتھ موجودہ تعلیمی میدان میں کامیابی کیوں مشکل ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ اگر مدارس اسلامیہ کے نصاب و نظام میں جدید علوم و فنون کو احسن طریقے سے شامل کر لیا جائے تو اس کے نتیجہ میں نہایت درجہ اچھے مسلمان، اچھے اہل علم، اچھے متقی، اچھے منتظم اور اچھے منصف پیدا ہو سکتے ہیں۔ سرسید کی طرز عمل کا سارا فلسفہ درست اور اس معاملہ میں علماء کے خیالات کی تائید و تصویب پوری طرح کرنے کے باوصف ہم یہ کہیں گے کہ آپ سے چوک ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبید اللہ سندھی اور بعض ایسے دوسرے حضرات نے اس کوتاہی کی طرف توجہ بھی دلائی لیکن ان کی بات نہ سنی گئی۔

پچھلے معاملات پر اس سے زیادہ تبصرہ و تنقید کیے بغیر ہم بڑے دردمندانہ انداز سے اپنے قابل احترام علماء سے درخواست کریں گے کہ ایک مخصوص فکر کے حامل اہل علم و دانش جو حکومتی مناصب پر فائز ہیں وہ تو دین اور دینی علوم کی بالادستی تسلیم کرنے سے رہے۔ آپ ان کے ہتھیاروں سے جو فی الحقیقت آپ کی متاع گم گشتہ ہیں، اپنے آپ کو مسلح کریں اور اس طرح ماحول پر چھا جائیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر اب بھی نصاب تعلیم کی اسی قدامت پر اصرار کیا گیا تو مستقبل نہایت درجہ تاریک شکل میں سامنے آئے گا جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid.com